ہاسٹل میں پڑنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کرلیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی۔ ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مُبارکباد دینے کے لئے آئے۔

قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں ۔ محلّے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی ۔ اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا اِنکشاف ہوا۔ کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے ۔ در اصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے ۔ جس کی نشو ونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا اِنحصار ہے ۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خُدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لئے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً اُن رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر و مُباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتے داروں" نے تو اس کو پاسِ وضع اور حفظِ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے اِنتہا سراہا ۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی ۔ اس لئے بلا تکلّف یہ فیصلہ کرلیا

گیا۔ کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے ۔ کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے ۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ کیا گیا ۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی ۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے ۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور ایماندار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی ۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا تھا ۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا ۔ کہ ہندوستان کا طریقۂ تعلیم بہت ناقص ہے ۔ اخبارات میں سے اِشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیسیں دے کر بیک وقت جرنلزم ۔ فوٹوگرافی ۔ تصنیف و تالیف دندان سازی ۔ عینک سازی ۔ ایجنٹوں کا کام ۔ غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جاسکتے ہیں۔ اور تھوڑے

عرصے کے اندر انسان ہرفن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی۔ اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا، کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سُنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب اِدھر اُدھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سُنے، تو معلوم ہوا، کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ

کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہوگیا۔ تو ثابت یہ ہوا۔ کہ خوش گوار مقام ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی۔ لیکن ایک مناسب حد تک۔ تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے۔ اور فطرت اپنا کام حُسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ صرف ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے، تو بہت خوب تھا۔ لیکن اُنہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا۔ کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گُناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہوگیا،

کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے۔ اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں، اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے، تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چُور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانہ میں ہزارہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا پھر فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی، کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور۔ مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید۔ مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنالیا۔ کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے، جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے۔ اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی

عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا۔ کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں، مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیرخوار بچہ تھا، تو وہ مجھ سے بے انتہا محبّت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا، کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیلِ علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دِل میں اُٹھ رہا تھا، وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زُعم میں والدین سے بھی زیادہ اِحتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ ہمارے دِماغی اور رُوحانی قُویٰ کو پھلنے پھُولنے کا موقع نہ ملے گا۔ اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ چُنانچہ وہی ہوا، جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مُرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اِجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچّوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صُحبت میں مَیں بھلا سینما سے کیا اَخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اِندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا۔

کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے۔ کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے۔ اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہونی چاہیئے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا۔ کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں، کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ناممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا

ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشو و نما کے لئے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے۔ کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا۔ ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں میں وطن کو واپس گیا۔ تو چند مختصر مگر جامع اور موثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو

دُور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سُپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظُلم و تشدّد کی چند مثالیں رِقّت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سُنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بِچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دِن شام کے وقت بِچارا ہاسٹل کو واپس آرہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آگئی۔ دو منٹ دیر سے پُہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سُپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بُلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سُن کر گھر کے لوگ سُپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہوگئے۔ ہاسٹل کی خُوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دِن موقع پا کر بِچارے محمُود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامتِ اعمال بِچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصُور اس سے یہ ہوا، کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اِتنی سی فضُول خرچی پر اسے

عُمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہوگئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے مُتاثّر نہ ہوئے۔ ان کے رویّے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک رُوپیہ کہنا چاہیئے تھا۔

اِنہیں ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں۔ اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چُھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اِختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پُختگی سی آگئی تھی، پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں، وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اکیلے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیّت نامکمّل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیّت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دِن تو ہم اس پر فلسفیانہ گُفتگو کرتے رہے۔ اور نفسیات کے نُقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسُوس ہوا، کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے

کی نوبت آئی، تو ذرا دِقّت محسُوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا، کہ وہ زبردست شخصیّتوں کے مالک ہیں ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی، کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جاسکے۔ ہر وُہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدینی اغراض" کے لئے واقعات کو ایک نئے اور اچھُوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرُورت پیش آتی ہے، لیکن اس پیرائے کا سُوجھ جانا اِلہام اور اِتفاق پر مُنحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کرسکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مُطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا اِنحصار، ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، تو ایک دن والد نے پُوچھا :

"تُمہارا شخصیّت سے آخر مطلب کیا ہے ؟"

مَیں تو خُدا سے یہی چاہتا تھا، کہ وُہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ مَیں نے کہا "دیکھئے نا۔ مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صِحّت بھی ضرُوری ہے، اور دِماغ کی صِحّت تو ضرُوری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اَور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ مَیں اس کو شخصیّت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے، نہ دِماغ سے، ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صِحت بالکل خراب ہو اور اس کا دِماغ بھی بالکل بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیّت ——— نہ خیر دِماغ تو بے کار نہیں ہونا چاہیئے ورنہ اِنسان خبطی ہوتا ہے —— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی۔ تو بھی —— گویا شخصیّت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریئے، مَیں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مُہلت دی جس کے دَوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا اِنتظار

کرتے رہے، اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا' مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہیئے۔شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔والد کہنے لگے۔"کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجیئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیئے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے!"

میں نے نسبتاً خفیف آواز سے کہا "جی ہاں۔"

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں سچ زیادہ بولتے ہیں۔نیک زیادہ ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا، اے کاش میں نے اس وقت توجّہ سے سُنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دِن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔لیکن میں نے ہمّت نہ ہاری۔ہر سال ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا۔لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹّیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدّ و مدّ کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔جب شخصیّت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا۔تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جُلنے

کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے اِنسان پارس ہوجاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یُوں ادا کیا۔ کہ ہاسٹل کی آب وہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکّھیاں اور مچھّر مارنے کے لیئے کئی کئی افسر مُقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یُوں سخن پیرا ہوا۔ کہ جب بڑے بڑے حُکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں۔ تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں' اس سے رسُوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جُوں جُوں زمانہ گزرتا گیا۔ میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اُنھوں نے یک لفظی اِنکار کا رویّہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وُہ ہاسٹل کا نام سُنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حُکم دے دیا کرتے تھے۔ ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگایئے۔ کہ

ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی، ہرگز نہیں۔ حقیقت صرف اِتنی ہے۔ کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اِقتدار کچھ کم ہوگیا تھا۔

اِتفاق یہ ہوا۔ کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا اِمتحان دیا، تو فیل ہوگیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قِصّہ ہوا۔ تو گھر والوں نے میری اُمنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے درپے فیل ہونے کی وجہ سے میری گُفتگو میں ایک سوز تو ضرُور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وُہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلی جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دَور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہوجائے گا۔

میں پہلے سال بی۔اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خُوب دِل لگا کر کیا تھا۔ اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہوگئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ اِرشاد ہوا، کہ صرف اِس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اِصطلاحاً" کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مُسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں، نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔)

اب جب ہم بی۔اے میں داخل ہونے لگے، تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے اِمتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا۔ کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم

رضامند ہوگئے۔ چنانچہ بی۔اے میں ہمارے مضامین انگریزی تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورتِ حالات پیدا ہوئی، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوتِ مطالعہ منتشر ہوگئی، اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے۔ تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا، اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا، بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کماحقہٗ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہوگیا۔ لیکن بی۔اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو

ہونا ہی تھا۔ کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں ۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہوگیا ۔ اب آپ ہی سوچیئے نا، کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صَرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صَرف نہ کرتا، بلکہ اس کی بجائے ـــــــ مگر خیر یہ بات مَیں پہلے عرض کرچکا ہوں ۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے ازحد حیرت کا موجب ہوا ۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی ۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دُھل گئی ۔ اور ہم فارسی میں پاس ہوگئے ۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہوگئے ۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں ۔

اب قاعدے کی رُو سے ہمیں بی ۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیئے تھا ۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے ۔ بعض طبائع ایسی ہیں، کہ جب تک یکسوئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کرسکتیں کیا ضروری ہے ۔ کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا

بنا دیا جائے ۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجّہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے ۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا، کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہوسکتے ہیں ۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے ۔ لیکن اس کے بعد ہم نے تہیّہ کر لیا، کہ جہاں تک ہوسکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے ۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں ۔ لیکن جتنا غور کیا اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے ۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہوگئے ۔ اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں ۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں :

(۱) انگریزی ۔ تاریخ ۔ فارسی ۔

(۲) انگریزی ۔ تاریخ
(۳) انگریزی ۔ فارسی
(۴) تاریخ ۔ فارسی

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہوسکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے ۔ اس کے بعد ہمارے لئے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہوگیا ۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی ۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا :

(۵) تاریخ میں فیل
(۶) انگریزی میں فیل

اِتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا ' تو ثابت ہوا ۔ کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے ۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے ۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہوجائیں ۔ لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا ۔ لیکن اس میں یہ مصلحت

تو ضرور مضمر ہے ۔ کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا ۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے ۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہوجائیں گے ۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بیتابی سے فیل ہونے کا اِنتظار کرنے لگے ۔ یہ اِنتظار در اصل فیل ہونے کا اِنتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا اِنتظار تھا، کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی ۔ اے ہوجائیں گے ۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا ، تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا ۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یکلخت اور فوراً ۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے ۔ اور پریشانی مُفت میں طُول کھینچتی ہے ۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے ، کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہوسکتے ۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا ۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی اُلجھن ہوتی ہے ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے ۔ میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں ۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن

ہے۔ چاہتا ہوں، کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے، تاکہ وقت پر اُنھیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں، کہ میری تمام تشریحات کو محض کسرِ نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا، کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، لیکن اِدھر اُدھر کے لوگ "اجی نہیں صاحب" "اجی کیا کہہ رہے ہو" "اجی یہ بھی کوئی بات ہے" ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال ایکے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسبِ دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دِل کو یہ تسلّی تھی، کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا، کہ وہ ہاسٹل کا قصّہ پھر شروع کرنا چاہیئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ تو عُمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے، تو ماموں کے دڑبے میں۔ اور جب ماموں کے دڑبے سے نکلے، تو شاید

اپنا ایک دڑبہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلّفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا۔ اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا، کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں، اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں۔ کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا اِنکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہوگیا، لیکن پھر بھی ان کے دِل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے" میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا

شوق ہو وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔"

میں نے جواب دیا۔ کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے، جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خموشی طاری ہوتی ہے۔ کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علےالصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں، جن کو ادبِ انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا

رُباعیوں میں تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ "تاریخ کے دلدادہ ....."

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ اِنتظار کہ کب فیل ہوں، اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی، اور انھیں یہ مژدہ سُنایا۔ کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آرہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مُفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادرِ مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے اِرد گرد ناتجربہ کار طلبا مُرغی کے بچّوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے۔ اور فلاں فلاں

قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا، تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمایئے، کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔